مولانا محمد حنیف ندوی

مشکلاتِ قرآن

جہاں تک قرآنِ حکیم کے تصورِ دینی اور نظریۂ حیات کا تعلق ہے اس کے سہل، آسان اور قابلِ عمل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس میں کہیں عقلی تضاد، فکری الجھاؤ، یا مضامین کا اختلاف رونما نہیں۔ اس کی منطق اور انداز بیان ایسا جامع اور دلنشین ہے کہ جہاں ایک حکیم اور فیلسوف اس سے خرد و دانش کے موتی چنتا ہے وہاں ایک عام آدمی بھی اس کی تعلیمات سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے فہم و ادراک کے پیمانے اپنے دامن میں کچھ اشکالات بھی لیے ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر ان اشکالات کا تعلق مضامین و تعلیمات اور پیغامِ حیات سے نہیں، اسلوبِ بیان اور طریقِ اظہار سے ہے اور عربی زبان کی ادائے خاص سے ہے بات یہ ہے کہ ہر زبان اظہار و تبیین کے مختلف انداز کی حامل ہوتی ہے۔ ہر زبان کی صرف و نحو، ساخت اور بناوٹ، دوسری زبان سے اس درجہ مختلف ہوتی ہے کہ بسا اوقات اس کا ترجمہ کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ عربی زبان کے بارہ میں ہم کہہ چکے ہیں، اس کو زبان سے زیادہ فن کے شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ عربوں نے صدیوں کی محنت و کاوش سے اس کو جس طرح پروان چڑھایا، جس طرح اس کو مخصوص معانی اور مطالب سے بہرہ مند کیا ہے اور اندازِ بیان کے اعتبار سے جس ذوق، جس حکمت اور فن کارانہ طرفہ طرازیوں سے مالا مال کیا ہے، دوسری زبانوں میں اس کی مثال قطعی نایاب ہے۔ یہی وجہ ہے، کسی بھی زبان میں ہم اس کے حسن و جمال کو بعینہٖ منتقل نہیں کر سکتے اور پھر اس کی بعض ادائیں تو ایسی اچھوتی ہیں جن کو کچھ وہی شخص جان سکتا ہے جس کا ذوق عربیت پختہ ہو۔ ورنہ یہی نہیں کہ ترجمہ کی صورت میں ان ادائے خاص کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے بلکہ دوسری زبان میں منتقل ہو کر اکثر یہ اپنی بلاغت، بے ساختگی، معنویت، با اپنے حسن و جمال ہی کو کھو بیٹھتی ہیں۔ یہی وہ مشکلات یا مقام ہیں۔

جو تشریح طلب ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھے اور جانے بوجھے بغیر ہم قرآن حکیم کی عظمتِ اظہار سے آشنا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

اس کے علاوہ مشکلات کی ایک نوعیت وہ ہے، جس کا تعلق یا تو قرآن کے طریقِ افہام و تفہیم سے ہے اور یا پھر وہ تاریخی تقاضوں کی بنا پر اُبھری ہیں۔ ان سب مشکلات کو ہم ان پانچ ابواب میں منحصر جانتے ہیں:

۱۔ حروفِ مقطعات ۲۔ اقسام القرآن

۳۔ محکمات و متشابہات ۴۔ مسئلہ ناسخ و منسوخ

۵۔ قرآن کے اسلوب بیان کی طرفہ طرازیاں۔

حروفِ مقطعات

مقطعات کے لغوی معنی مختصرات کے ہیں، لیکن اس اختصار کی نوعیت کیا ہے اور یہ معانی کس اسلوب سے ان حروف سے مستنبط ہوتے ہیں؟ اس میں مفسرین کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

مکی سورتوں کے آغاز میں یہ حروف کئی صورتوں میں آئے ہیں۔ کبھی بسیط کی شکل میں۔ جیسے صاد، قاف اور القلم، اور کبھی ترتیب و تالیف لیے ہوئے، جیسے الم، الر، اور حٰمٓ وغیرہ۔ یہ حروف بحیثیت مجموعی ۱۴ ہیں۔ جو حروف ہجا کا نصف ہیں۔ ان حروف کے استعمال میں ایک خاص حکمت یہ پنہاں ہے کہ اس میں صوت و آہنگ کے اعتبار سے ان تمام اقسام کے حروف آگئے ہیں جو عربی زبان میں عموماً مستعمل ہیں۔ مثلاً حروف حلقی میں سے ہمزہ، ہا، عین، حا، غین اور ھا۔ حروفِ مہموسہ میں سے سین، حا، کاف صاد اور ہا اور مجہورہ میں سے ہمزہ، میم، لام، غین، را، طا، قاف، یا اور نون۔ اسی طرح حروف قلقلہ میں سے قاف اور طا وغیرہ گویا صوت و آہنگ کے نقطۂ نگاہ سے ان حروف نے عربی زبان کے تمام ذخیرۂ الفاظ کا احاطہ کر رکھا ہے۔

حروفِ مرکبہ میں یہ عجیب و غریب رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جس طرح عربی لغت کا ذخیرۂ الفاظ دو حرفوں سے لے کر پانچ حرفوں تک ترکیب پذیر ہے، ٹھیک اسی طرح یہ حروف بھی دو سے لے کر پانچ حروف تک ترکیب پذیر ہیں۔

مزید برآں ان حروف کے استعمال میں ایک اور معجزانہ اتفاق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جہاں جہاں ان کا استعمال ہوا ہے وہاں ان کے معاً بعد کسی نہ کسی صورت میں عموماً نزولِ قرآن یا قرآنِ حکیم سے متعلق کسی اہم نکتہ کی وضاحت بھی مذکور ہے - جیسے

الم - ذالک الکتاب لا ریب فیہ

طٰہٰ ۵ ما انزلنا علیک القران لتشقی ۵

قٓ والقران المجید -

ان مناسبتوں کے پیشِ نظر، زمخشری، بیضاوی، ابنِ تیمیہ اور ان کے شاگردِ رشید حافظ مزی نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ ان سے مراد دراصل مکہ والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ قرآن حکیم جو اعجاز کا دعویدار ہے، کسی انوکھے ذخیرۂ حروف و الفاظ سے ترکیب پذیر نہیں بلکہ انہی حروف و الفاظ کی ترتیب و تالیف سے یہ فصاحت و بلاغت کے اس مرتبہ بلند تک پہنچا ہے جسے اعجاز سے تعبیر کیا جاتا ہے جن کو تم روزانہ بول چال میں استعمال کرتے ہو- پھر یہ کیا بات ہے کہ اس میں اور انسانی کلام میں زمین آسمان کا فرق ہے - زبان و ادب کے اعتبار سے یہ کیوں معجزہ اور خارقہ کے مرتبہ پر فائز ہے- اور تمہارا کلام کیوں فصاحت و بلاغت کی ان بلندیوں سے محروم ہے-

بات یہ ہے کہ انسانی کلام اور کلامِ الٰہی میں وہی فرق رونما ہے جو انسانی صنعت اور اللہ کی صنعت میں جلوہ گر ہے - انسان عقل و ہنر سے جن عناصرِ مادی سے کام لے کر ترکیب و تالیف کے عجیب و غریب اور حسین و جمیل پیکروں کی تخلیق کرتا ہے، بعینہٖ وہی مادی عناصر چاند، سورج، نجوم و کواکب اور حیوان اور انسان کی بناوٹ میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں کتنا تفاوت اور کس درجہ فرق پایا جاتا ہے اس کو ہر کوئی جانتا بوجھتا ہے - یہی وجہ ہے ہر شخص پہلی ہی نظر میں ان دونوں کے بارہ میں یہ جان لیتا ہے کہ ان کا تعلق انسانی صنعت سے ہے یا دستِ قدرت کی صنعت گری سے - گویا حروفِ مقطعات کے استعمال سے قرآنِ حکیم نے مکہ والوں کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ گو یہ کتاب ہدیٰ انہی الفاظ و حروف سے تالیف پذیر ہے جن سے تم شعر و ادب

کے ذخائر تیار کرتے ہو، تاہم یہ کتاب اپنے پیغام، اسلوب اور مرتبۂ فصاحت کے اعتبار سے انسانی کلام سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی کہ کوئی قدرتی شے انسانی ہاتھ سے بنی ہوئی شے مختلف ہو سکتی ہے۔[۱]

ہمارے نزدیک تفسیر حروف کا یہ انداز معقول اور لگتا ہوا ہے کیونکہ اس کی تائید میں ان تین واضح مناسبتوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ یہ حروف عموماً وہی ہیں جن سے عربی زبان کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ حروف مخرج اور صوت و آہنگ کے نقطۂ نگاہ سے تمام اقسامِ مشہورہ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سوم ان سب کے بعد قرآن حکیم کے بارہ میں کسی نہ کسی اہم نقطہ کی وضاحت مذکور ہے۔ ان تین مناسبتوں کو اس مخصوص سیاق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کیجیے تو بات اور واضح ہو جائے گی کہ یہ حروف اس دعویٰ کی تائید میں نازل ہوئے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب اور وحی و تنزیل کا کرشمہ ہے، انسانی فکر و تامل کا نتیجہ نہیں۔ یہ نطق جبریل ہے اور ایسی فصیح و بلیغ اور جامع ہے کہ انسانی کوششیں اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

الٓمٓ ۝ تنزیل الکتٰب لا ریب فیہ من رب العٰلمین ۝[۲]

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کتاب کی تنزیل پروردگار عالم کی طرف سے ہوئی ہے۔

انہ لقول رسول کریم[۳]

یہ قرآن، فرشتہ عالی مقام کے ذریعہ پہنچنے والا پیغام ہے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القران لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا[۴]

کہہ دیجیے، اگر جن و انس مل جل کر قرآن کی نظیر پیش کرنا چاہیں، تب بھی ایسا نہ کر سکیں گے۔ اگرچہ اس بارہ

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے، الکشاف ۱/۱۷۔ البرہان ۱/۱۶۵۔ الاتقان ۲/۱۳۔ مباحث فی علوم القرآن، ص ۲۳۴ تا ۲۳۶۔ نیز فی ظلال القرآن، تفسیر الٓمٓ۔

[۲] السجدہ : ۲ [۳] الحاقہ : ۴۰ [۴] بنی اسرائیل : ۸۸

میں ان کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہو۔

مقطعات کے معنی چونکہ مختصرات کے ہیں، اس لیے ان کی تفسیر و تاویل کا ایک انداز یہ اختیار کیا گیا کہ الف سے مراد اللہ ہے۔ ل، جبریل کا مخفف ہے اور میم سے مقصود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یا ذات خدا کی صفت قاہرہ پر دلالت کناں ہے۔ عین عزیز سے تعبیر ہے اور حرف نون، نور کا اختصار ہے۔ لیکن تاویل کا یہ انداز سراسر موضوعی ہے معروضی نہیں۔ یعنی اس کا تعلق ہر مفسر کے اپنے ذوق اور اپنے اسلوب فہم سے ہے۔ یہ اس منطق سے تہی ہے جو دوسروں میں علم و ادراک یا یقین و اذعان کی کیفیتوں کو پیدا کر سکے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک مدرسہ فکر یہ ہے کہ ان حروف کو رموز و اسرار کے قبیل کی شے قرار دیا جائے۔ اور جمل کے قاعدہ سے جسے ابی جاد بھی کہتے ہیں کہ ہر حرف کی قیمت دریافت کر کے اس کو بعض تاریخی واقعات پر چسپاں کیا جائے۔ جیسے کہ احمد بن خلیل بن سعادۃ ایک مشہور فقیہ اور مناظر سے مروی ہے کہ بعض ائمہ نے الٓمٓ غلبت الروم سے فتح بیت المقدس کی تاریخ نکالی اور وہ صحیح ثابت ہوئی۔

اس طریق استدلال پر اصولاً تین اعتراض وارد ہوتے ہیں:

اوّلاً۔ قرآن حکیم کی تعلیمات بالکل واضح اور بین ہیں، لہٰذا ان میں کوئی بات ایسی ڈھکی چھپی نہیں ہو سکتی جس کو ایک طبقہ تو سمجھتا ہو اور دوسرا نہ سمجھتا ہو۔ یوں بھی قرآن کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں جو کچھ ہو صاف اور واشگاف انداز میں ہو۔

ثانیاً۔ یہ انداز استدلال بھی موضوعی نوعیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس انداز استنباط سے مخالف بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس طرح کہ موید ین۔ جیسا کہ یہودیوں نے آنحضرت سے بعض آیات کو سن کر اندازہ کیا اور کہا اس کتاب پر کیا غور کریں جو زیادہ عرصہ زندہ رہنے والی اور چلنے والی نہیں۔

ثالثاً۔ تاویل کے اس نہج کو اگر مان لیا جائے تو اس سے باطنیت کی تائید ہوتی ہے اور قرآن کا فہم و ادراک، جو لسان روایت کے مثبت اور بامعنی قواعد اور پیمانوں پر مبنی ہے، محض ذاتی و انفرادی ذوق و وجدان کا مسئلہ بن جاتا ہے اور ایسے ایسے شطحیات کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے، جو

قطعی ناقابل فہم ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر متکلمین نے اس انداز تاویل کو ماننے سے انکار کر دیا

حروف مقطعات کی علمی و عقلی توجیہ کے بارہ میں بعض مستشرقین دور کی کوڑی لائے ہیں۔ چنانچہ نولاکی (NOLDCKE) نے کہا کہ یہ حروف سور کا حصہ یا متن قرآن نہیں بلکہ ان صحابہ کا مخفف نام ہے جنھوں نے اپنے لیے مصاحف قرآن کی مختلف نقول تیار کیں۔ مثلاً سین سے مراد سعد بن ابی وقاص ہیں، میم سے مغیرہ اور نون سے حضرت عثمان متصور ہیں۔ تاویل کا یہ انداز چونکہ صراحتاً غلط اور غیر منطقی تھا، اس لیے نولاکی نے بالآخر اس سے رجوع کر لیا۔ لیکن بل (BUHL) اور ہرش فیلڈ (HIRSHFELD) وغیرہ کی اس سے تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے اس کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور چاہا کہ اس کی معقولیت کو علوم قرآن سے شغف رکھنے والے مستشرقین تسلیم کر لیں۔ مگر ان کی یہ کوششیں دوسرے سنجیدہ علمی حلقوں میں مقبول نہ ہو سکیں۔ کیونکہ قرآن حکیم کے متن میں، جس کا ایک ایک لفظ اور شوشہ محفوظ ہے غیر قرآن کا اندراج اتنی بڑی جسارت ہے کہ جس کو اسلامی ذہن کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جانے کہ اس پر حفاظ صدیوں خاموش رہیں اور کوئی احتجاج نہ کریں۔ یہ نظریہ اس لیے بھی ماننے کے لائق نہیں کہ قرآن حکیم کوئی پارینہ اور متروک العمل دستاویز تو نہیں۔ یہ تو ایسی زندہ کتاب ہے جو ہر دور میں لاکھوں سینوں میں ضیا گستر رہی اور صبح و شام جس سے استفادہ کا عمل جاری رہا۔ ایسی کتاب میں تحریف کی یہ نوعیت بھلا کب ممکن ہے۔ علاوہ ازیں اس نظریہ سے تمام حروف مقطعات کی تشریح بھی تو ممکن نہیں۔ اس بنا پر ہم اس اپچ کو ایجاد بندہ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

آخر میں ہم اس سلسلہ میں علامہ رشید رضا کی اس لسانی و ادبی توجیہ کو پیش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک زمخشری کے اسلوب تاویل کے بعد اس لائق ہے کہ اس کو خصوصیت سے درخور اعتنا قرار دیا جائے اور اس کی روشنی میں ان حروف کے جواز و اہمیت پر غور کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کا دستور تھا کہ کسی تقریر یا قصہ کا آغاز عموماً ایسے حروف سے کرتے جن سے سامع کو خواب غفلت سے بیدار کیا جاتا۔ اس کے ذوق التفات کو اکسایا جاتا اور قلب و ذہن کو متوجہ کیا جاتا کہ وہ خطاب یا تقریر کو پوری دلجمعی سے سنے اور آویزۂ گوش بنائے جیسے اَمّا اور اَلا۔ ان کے

نزدیک حروفِ مقطعات بھی اسی قبیل سے ہیں اور ان سے مقصود یہ ہے کہ سامعین ذہنی وعقلی طور پر اس کتابِ ہدایت کو سننے پر آمادہ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں ان حروف کی حیثیت تمہیدی اور تنبیہی حروف کی ہے جن کے استعمال سے عربوں کا ذوق اچھی طرح آشنا تھا۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے ان میں اضافہ کیا ہے اور ان کے استعمال میں اس رعایت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ ان میں اور سورت کے آہنگ میں پورا پورا توافق پایا جائے۔

اگرچہ اس نظریہ کی تائید میں عربی نثر سے تائیدی شواہد کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم لسانی وادبی نقطہ نظر سے اس میں خاصی معقولیت پائی جاتی ہے۔ عربی نثر میں اس طرح کے نظائر کا پایا نہ جانا عدم وجود پر دلالت کناں نہیں، کیونکہ عربوں نے زیادہ تر شعر ہی کے ذخائر کو محفوظ رکھا ہے۔ ایسی نثر اور اس کے ذخائر خاص تو حفظِ روایت کے ذریعہ ہم تک پہنچ نہیں پائیں۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ جس شی کو علامہ رشید رضا نے بطور قیاس کے پیش کیا ہے، وہ صحیح اور حقیقت پر مبنی ہو۔

اقسام القرآن

قرآن حکیم میں متعدد مقام ایسے ہیں جن کا افتتاح کسی نہ کسی قسم سے ہوا ہے۔ جیسے والصافات[1] والذاریات[2]، والطور[3] والنجم[4] والمرسلات[5] والنازعات[6] والسماء ذات البروج[7]، والسماء والطارق[8]، والفجر[9]، والشمس[10]، واللیل والضحی[11]، والتین[12]، والعادیات[13]، والعصر[14]۔

ان اقسام سے کیا مقصود ہے؟ اس سے مراد مقسم بہ کی عظمت و جلال کا بیان کرنا ہے۔ یا ان کی افادیت و نفع رسانی کا اظہار مطلوب ہے۔ یا ان فواتح کا تعلق اسرار الٰہی سے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ، اور چند اہل علم و بصیرت کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ان میں کوئی احتمال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ جہاں تک عظمت و اجلال کا تعلق ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسی حقیقت نہیں جس کو اللہ تعالیٰ عظمتِ اجلال کا مستحق قرار دے کر اس کی قسم کھائے۔ اور پھر ان میں ایسی اشیا کا بھی تذکرہ بطور قسم کے ہوا ہے جن میں عظمت کا کوئی پہلو پایا نہیں جاتا۔ افادیت و نفع رسانی کو بھی کلیہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ رہا ان فواتح کا اسرارِ الٰہی میں سے ہونا۔ تو یہ ان دونوں میں سے زیادہ بعید تر

احتمال ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ کتاب واضح اور مبین، دوسرے یہ پیغام جسے ہم اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاف اور صریح، تیسرے عربی زبان اظہار بیان کے لحاظ سے بے مثل اور چوتھے یہ کہ جن لوگوں میں اس کا نزول ہوا وہ عربی زبان کے رموز و ادا سے پوری طرح آشنا اور واقف۔ ان حالات میں کیونکر ممکن تھا کہ اس میں کوئی بات معمہ کی قسم کی ہوتی یا غیر واضح اور شطحات و اسرار کے قبیل کی ہو سکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ ان اقسام سے مراد استشہاد اور استدلال کی ایک خاص شکل ہے، جس میں مقسم بہ کو مقسم علیہ کی دلیل ٹھہرایا گیا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ اس نوع کے فواتح کا تعلق شہادت کی اس نوعیت سے ہے جس کو کسی دعویٰ کے اثبات میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے مخاطبین اولین کو ان کے فہم و ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ انھوں نے ان آیات کو سنا اور زبانِ حال سے کہا

سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر۔

ہم نے تیرا حکم سنا اور قبول کیا۔ اے پروردگار ہم تیری بخشش کے خواہاں ہیں اور تیری طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

کیونکہ قسم کو استدلال اور دلیل کے طور پر استعمال کرنا عربوں میں جانا بوجھا دستور تھا۔ یہی وجہ ہے قرآنِ حکیم نے قسم کو بغیر کسی تکلیف کے دلیل و برہان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔[۵]

اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی دلیل ہے۔

آیئے اس اسلوب استشہاد کو چند مثالوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

سورۃ الصفّٰت میں جن اقسام کو پیش کیا گیا ہے، ان سے جس دعویٰ کا اثبات مطلوب ہے وہ یہ ہے۔ ان الٰھکم لواحد۔ کہ بلاشبہ تمھارا پروردگار، یگانہ اور ایک ہے۔ اور اس کے ثبوت میں فرشتوں کے کچھ کوائف کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کوائف کی تشریح کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ فرشتوں کے بارہ میں اہل جاہلیت کا مسلمہ عقیدہ یہ تھا کہ یہ دیبیاں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ ان

---

[۵] الواقعہ: ۷۶

یائف میں اس عقیدے کی تردید مضمر ہے۔ ارشاد باری ہے کہ جن فرشتوں کو تم اللہ یا خدا قرار دیتے ہو ان کی اطاعت و بندگی کا تو یہ عالم ہے کہ صف باندھے ارشاداتِ ربانی کی تکمیل و انصرام کے سلسلہ میں ہمہ وقت تیار بیٹھے ہیں۔ یہی نہیں، دنیا میں امورِ خیر کی تلقین اور برائیوں سے لوگوں کو روکنے کا اہم فرض بھی انجام دیتے ہیں۔ مزید برآں اللہ کے ذکر، اس کے کلام کی تلاوت اور اس کے پیغام کی اشاعت و فروغ میں بھی ان کی لگن اور مصروفیت کا یہی عالم ہے۔ ظاہر ہے اللہ کی جس مخلوق کی خوئے اطاعت کا یہ حال ہو وہ خدا تو نہیں ہو سکتی۔

سورۂ ذاریات میں مقسم بہ کو چار خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، الذاریات[1]، الحٰملٰت[2]، الجٰریٰت[3] اور المقسمٰت[4]۔ اور مقسم علیہ ہے۔ انما توعدون لصادق، وان الدین لواقع۔ یعنی مکافاتِ عمل اور یوم الحساب کا جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ صحیح اور درست ہے۔ یہ جاننے سے پہلے کہ ان اقسام میں استشہاد و استدلال کا کون سا پہلو پایا جاتا ہے، پہلے ان الفاظ کے معانی اور مطالب سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ تفاسیر و سیر کی کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی نے برسرِ منبر یہ ارشاد فرمایا کہ قرآن حکیم کے بارہ میں جو چاہو مجھ سے پوچھو میں اس کا جواب دوں گا۔ ایک شخص (غالباً ابن الکوا) نے دریافت کیا کہ حضرت الذاریات سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا، ہوا۔ اور الحٰملٰت کے کیا معنی ہیں، آپ نے فرمایا، ابر۔ پھر اس نے الجٰریٰت اور المقسمٰت سے متعلق پوچھا، آپ نے علی الترتیب اس کے جواب میں کہا، کشتیاں اور فرشتے۔ حضرت فاروق اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ان اقسام کے یہی معنی منقول ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ اس دعویٰ کے اثبات میں کہ حشر کا ایک دن مقرر ہے، جس دن تمہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نشانات اور نظام پر غور کرو۔ وہ کیونکر تیز و تند ہوائیں چلاتا ہے جو چاروں طرف گرد و غبار کو بکھیر کر زمین کی روئیدگی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کس طرح ایسی ہواؤں کو حرکت میں لاتا ہے جو اپنے دوش پر ابر و سحاب کے ٹکڑوں کو اٹھائے اٹھائے پھرتی ہیں اور پانی کے چھینٹے برساتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ کشتیوں کو دیکھو کہ اسی

ہوا کے بل پر چلتی اور مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس نظام رشد و ہدایت پر فکر و تدبر کی صلاحیتوں کو کام میں لاؤ کہ اس نے خیر کی اشاعت و فروغ اور برائی کی روک تھام کے لیے کس طرح فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اس نظام پر تم جس قدر غور کرو گے، یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہوتی چلی جائے گی کہ یہ عنایات، یہ نظم و نسق اور انسان کی فلاح و بہبود کا یہ غیر معمولی اہتمام یوں ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنے آپ کو پہچانے، کیونکہ ایک دن ایسا آئے گا جب ان انعامات کے بارہ میں اس سے پوچھا جائے گا۔ اس دن کا آنا اس لیے برحق ہے کہ انعاماتِ الٰہی کی یہ ارزانی بلاوجہ اور بلاسبب نہیں ہو سکتی۔ یوں بھی نظامِ تکوینی کی یہ استواری اس بات کی مقتضی ہے کہ اخلاق و عمل اور عقیدہ و کردار کا بھی ایک نظام ہو جن کے بارے میں بازپرس ہو سکے اور جن کے بل پر آئندہ زندگی کے خطوط کو متعین کیا جا سکے۔

سورہ طور کا موضوع بھی قیامت اور احوالِ قیامت کی تشریح و توضیح ہے اور اس حقیقت کی پردہ کشائی ہے کہ یہ منکرین اسلام آج جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں، اس بات کو ہرگز نہ بھولیں کہ ایک دن بہرحال ایسا آنے والا ہے، جب ان پر اللہ تعالیٰ کی شدید گرفت ہوگی اور کوئی طاقت اس وقت ان کو عذابِ الٰہی سے چھڑا نہ سکے گی۔ کیونکہ محاسبہ اور احتساب اور مکافاتِ عمل کا قانون اٹل ہے لہٰذا اس کا نفاذ ہو کر رہے گا۔ بالخصوص جب کچھ قومیں کفر اور فسق و فجور پر اصرار کرتی ہیں اور دعوت و انذار کے بعد بھی۔ اپنے گناہوں سے باز نہیں آتیں، تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ احتساب حرکت میں آئے اور ان کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ اس تمہید کے بعد مقسم بہ الفاظ کی تشریح ملاحظہ ہو۔ طور سے مراد یہودی ہیں جنھوں نے اس پہاڑ کے دامن میں زندگی بسر کی اور اللہ کے قانون کو برابر جھٹلاتے رہے۔ طور سے مراد یہودی اس بنا پر ہیں کہ کبھی کبھی عربی زبان میں مکان سے مقصود مکین ہوتا ہے۔ کتاب مسطور سے مراد ہر وہ نوشتہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہو۔ اس سے مراد تورات و انجیل اور قرآن بھی ہو سکتا ہے اور لوحِ محفوظ بھی۔ البیت المعمور کعبہ یا بیت اللہ کا نام ہے۔ السقف المرفوع سے مقصود نظامِ

علوی یا آسمان ہیں۔ البحر المسجور، سمندر کی اس کیفیت سے تعبیر ہے جب وہ قیامت کے روز شدتِ حرارت سے کھول اٹھے گا۔

یہ تو مقسم بہ الفاظ کی تشریح ہوئی۔ مقسم علیہ یہ بات ہے:

ان عذاب ربک لواقع۔

کہ تمہارے پروردگار کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔

مالہ من دافع۔

اور کوئی بھی اس کو روک نہیں سکے گا۔

غرض یہ ہے کہ جہاں تک عذابِ الٰہی کے امکان و وقوع کا تعلق ہے، اس کے بارہ میں غور و فکر کے کئی پہلو ہیں۔ سب سے پہلے بنی اسرائیل اور ان کی مسلسل ضد اور ہٹ، نافرمانی اور روحِ شریعت سے روگردانی کو دیکھو تو خود بخود اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم پر اللہ کا عذاب آنا چاہیے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس قوم پر متعدد بار عذاب آیا۔ بیت اللہ جو انوار و تجلیاتِ الٰہی کا مرکز ہے اس کی بے حرمتی بھی عذابِ الٰہی کا موجب ہوئی ہے۔ ابرہہ اور اس کے ساتھیوں کا انجام ہر مکہ والے کو معلوم تھا۔

"السقف المرفوع اور البحر المسجور" کا تعلق اس آنے والے وقت سے ہے۔

فقہائے ہند۔ جلد سوم

از محمد اسحاق بھٹی

فقہائے ہند جلد سوم شائع ہو گئی ہے۔ یہ جلد دسویں صدی ہجری کے برصغیر پاک و ہند کے فقہائے کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و عملی خدمات کو محیط ہے۔

قیمت: ۲۲ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور